قاضی عبدالستار: ایک زندہ افسانوی کردار

پروفیسر صغیر افراہیم

سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)

موبائل کی مسلسل بجنے والی گھنٹی نے گہری نیند سے بیدار کیا، آواز قاضی عبدالستار کی تھی۔ صغیر، گڈّا (دُرّیز ستار) نہیں رہا۔ صغیر، گڈّا نہیں رہا۔ میں آرہا ہوں۔ نہیں۔ کال کٹ گئی۔ رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ میں حواس کو یکجا کررہا تھا۔ کال آئی۔ گاڑی کا انتظام کرو۔ سیتاپور جاؤں گا۔ میں نے ایس۔ کے۔ ٹریولس کے ببّو بھائی سے رابطہ قائم کیا۔ فوری، آرام دہ گاڑی کے لیے کہا۔ سیما اور ثنا فکر واستعجاب کی کیفیت میں بیٹھی تھیں کہ پھر کال آئی۔ صغیر میں نہیں جاؤں گا۔ گڈے کی مسخ شدہ جسم کو نہیں دیکھ سکوں گا۔ اُن کے منع کرنے کے باوجود میں سرسید نگر میں اُن کی رہائش گاہ پہنچ گیا۔ گیٹ اور کمرے کا دروازہ بند تھا، مگر کمرے میں تیز روشنی تھی، اس کا احساس کھڑکیوں سے ہورہا تھا۔ نہ جانے کیوں دستک دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ہر طرف سنّاٹا تھا۔ گاڑی ایک کنارے کھڑی کرکے اِدھر اُدھر ٹہلتا، آہٹ لیتا رہا۔ ابھی تین دن پہلے (۱۸؍جنوری ۲۰۱۷ء) قاضی صاحب نے گڈّے کو بلایا تھا۔ پٹنہ سے ڈاکٹر عبدالغفور (وزیر اقلیتی فلاح و بہبود حکومت بہار) نے قاضی صاحب سے ملنے اور اپنی تصنیف ''قاضی عبدالستار: بحیثیت ناول نگار'' کو ریلیز کرنے کی درخواست کی تھی۔ قاضی صاحب نے مکمل ذمہ داری میرے سپرد کی تھی۔ آناً فاناً البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی (علی گڑھ) میں اہتمام وانتظام ہوگیا۔ گڈّا اپنی نئی گاڑی سے آگیا تھا۔ بیگم ساتھ میں تھیں۔ گڈّا قاضی صاحب کے مزاج سے واقف اور اُن کے ہر اشارے کو سمجھتا اور اُس پر عمل کرتا تھا۔ شاید اسی لیے وہ اپنی اولادوں میں گڈّے کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اور وہ بھی اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود قاضی صاحب کے ہر حکم کو خوشی خوشی بجالانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ اُس کے آنے سے میں قاضی صاحب کی تیاری، اُن کے لانے لے جانے کی طرف سے مطمئن ہوگیا تھا۔ قاضی صاحب گڈے کی گاڑی اور اُس کی ڈرائیونگ کی تعریف کرتے تھے۔ اگلے دن یعنی ۱۹؍جنوری (۲۰۱۷ء) کو وہ یادگار پروگرام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور قاضی صاحب کے ناولوں پر تحریر کردہ تحقیقی مقالہ کی رسم اجرا پروفیسر سید محمد امین کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔ صدارت جناب قاسم خورشید نے کی۔ درجنوں برگزیدہ شخصیتیں اُس میں شامل تھیں، گڈّا اس تقریب سے بہت خوش تھا۔ اگلے دن وہ اپنی بیگم کے ساتھ لکھنؤ چلا گیا۔ تین دن کا یہ منظر نامہ نظروں میں اس طرح گڈمڈ ہورہا تھا کہ کسی ایک سرے پر ٹھہر کر سوچنے ہی نہیں پارہا تھا کہ دور کہیں فجر کی اذان سنائی دی۔ گھر واپس گیا۔ سیما سے باتیں ہورہی تھیں کہ قاضی صاحب کا فون آیا۔ آجاؤ۔ فوری پہنچا۔ گیٹ کُھلا ہوا تھا۔ آہستہ سے کمرے کے پٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ تمتمایا ہوا چہرہ، روشن اور نم ناک آنکھیں مجھ سے ہم کلام تھیں کہ اسی بیچ قاضی صاحب نے میری طرف ایک فولڈ کیا ہوا کاغذ بڑھادیا۔ اسے لفافہ میں رکھ کر اشرف (سید محمد اشرف) کو پوسٹ کردو۔ آنکھوں کی جنبش خط کو پڑھنے کی اجازت مرحمت کررہی تھی۔ میں خط کی تحریر اور قاضی صاحب کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں ساکت مگر اُن کی تہہ میں ہلچل۔ تحریر میں محض حادثے، گڈّے کی دردناک موت کی روداد ہی نہیں باپ کا درد بھی اپنی تمام شدّت کے ساتھ موجود تھا۔ وہ درد جسے باپ نے جھیلا، شاگردوں نے محسوس کیا۔ وہ درد جو کبھی ناول داراشکوہ میں اُبھرا جس سے شاہ جہاں دوچار ہوا تھا، ایک میں خلق کردہ کردار کی موت کا منظر، دوسرے میں لخت جگر کا رخت سفر۔ جملوں میں بیٹے کی محبت کے ساتھ شاگرد رشید سے اُنسیت، اپنائیت، بھروسہ، اعتماد.... قیامت کی گھڑی، کرب کی کیفیت میں حالِ دل کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کا یہ احساس پہلی بار نظروں کے سامنے تھا، جو غماز تھا کہ فنکار اسی کیفیت میں ڈوب کر کردار خلق کرتا ہے تبھی تو شاعر کہہ اٹھتا ہے:

خونِ شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا
فنکار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

اس جان لیوا حادثہ کو ابھی مشکل سے اکیس (۲۱) ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ ۲۹/اکتوبر ۲۰۱۸ء بروز پیر یہ اندوہناک اطلاع ملی کہ دیررات اُستادمکرم، پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شام ساڑھے چار بجے منٹوای (علی گڑھ) میں تدفین ہے۔ یہ خبر مجھے کانپور میں ملی جہاں میں اپنی اہلیہ کے ساتھ ایک تدفین میں شرکت کی غرض سے گیا تھا۔ سیما کے عزیز، سید عتیق احمد نے جن سے میرے دوستانہ مراسم تھے، طویل علالت کے بعد دہلی کے گنگا رام اسپتال میں آخری سانس لی۔ اُن کی تدفین کانپور میں تھی۔ انھیں کاندھا تو نہیں دے سکا، مگر جامعہ کے اشرف آباد کے قبرستان میں دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ بلند کیے ہوئے تھا کہ پروفیسر ابن کنول نے یہ اندوہ ناک اطلاع دی۔ کب، کیسے، کہاں کی وضاحتی تکرار کے بعد دل مسوس کر رہ گیا۔ دماغ غوطے کھانے لگا۔ اپنے مزاج، اپنی مرضی اور اپنے طریقہ سے زندگی بسر کرنے والا فنکار، اپنے رب سے جاملا۔ ورنہ ہم لوگ تو اُن کی پسند کے گھر کا انتظام کر چکے تھے۔ اُنھیں دہلی سے صحت یاب ہوکر منتقل ہونا تھا۔ اشرف آباد کے قبرستان سے ملحق مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر احباب سے تفصیل معلوم کی تو پتہ چلا کہ پچھلی رات کو ہی وہ ہم سے رخصت ہوکر مالک حقیقی سے جاملے۔ علی گڑھ کیسے پہنچوں سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ شتابدی رات آٹھ بجے پہنچے گی۔ بائی روڈ بھی اس سے پہلے پہنچنا آسان نہیں تھا۔

عتیق بھائی کی قبر کے پاس اُن کے دونوں بچے کھڑے تھے جن کی پڑھائی ابھی مکمل ہوئی ہے۔ پہلے اُن کی والدہ برین ہیمریج کی وجہ سے اچانک رخصت ہوگئیں اور اب والد۔ دولت تھی، علاج پر پانی کی طرح پیسہ بہایا مگر... کل نفسٍ ذائقۃ الموت، قاضی صاحب کے پاس بے حد شہرت تھی، مگر موت اپنا کام کرگئی۔ رات ساڑھے آٹھ بجے منٹوای پہنچا تو اپنے ہی نہیں، اُن کے تمام خلق کردہ کردار بھی دعائے مغفرت کے ساتھ رخصت ہو چکے تھے۔ فضا احساس دلا رہی تھی کہ فرد رخصت ہوجاتا ہے، مگر یادیں باقی رہتی ہیں اور یادوں کو فن پارے کی شکل میں ڈھال دینے والے فنکار زندۂ جاوید ہوجاتے ہیں۔ قاضی صاحب ایسے ہی فنکار ہیں جنھوں نے تاریخ وتہذیب کو افسانوی ادب میں اس خوبی کے ساتھ تحلیل کردیا ہے کہ ان میں ماضی وحال ہی نہیں، مستقبل کی آہٹ بھی محسوس کرلیتے ہیں۔

اتفاقات کیا کچھ کرتے ہیں۔ سمجھ سے بالاتر ہے۔ کانپور عجلت میں گیا، مگر عتیق صاحب کے دیدار نہیں ہوسکے اور یہاں فوری واپسی کے باوجود اپنے کرم فرما، استاذِ مکرم کو کاندھا نہیں دے سکا۔ اِس کا افسوس ہمیشہ رہے گا۔ ایسا اُستاد جو نہ صرف اپنے شاگردوں کو عزیز رکھتے ہوئے اُن کی تربیت کرتا بلکہ افسانوی دنیا میں اُن کی شناخت کی دعائیں بھی کرتا ہو، فی زمانہ کمیاب ہے۔ بلاشبہ استادمکرم بیسویں صدی میں ہی نہیں اکیسویں صدی کے ادبی تناظر میں بھی اپنے منفرد اسلوبِ بیان کی وجہ سے ایک ایسے دبستان کی شکل اختیار کرچکے ہیں جس نے نئی نسل کے سامنے متوازن اور مؤثر اظہار کی نادر مثال رکھی ہے اور یہ یقین دلایا ہے کہ افسانوی ادب کی اصل روح فکشن نگار کا باطن ہے۔ وہ اپنے رکھ رکھاؤ، وضع قطع اور لہجہ کی وجہ سے ادبی حلقوں میں ایک زندہ داستانوی اور افسانوی کردار کی طرح شہرت رکھتے تھے۔ اُن کے طویل ادبی سفر کا جب کبھی تفصیلی جائزہ لیا جائے گا تو اُس میں ایک پوری تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی تاریخ نظر آئے گی۔ جو دُھندلا رہی ہے اور اگلے وقتوں کی بات بنتی جارہی ہے۔

۹/فروری ۱۹۳۳ء کو مچھریٹہ، ضلع سیتاپور کے ایک صاحبِ حیثیت گھرانے میں پیدا ہونے والے قاضی صاحب نے انٹرمیڈیٹ کے دوران افسانوی دنیا میں قدم رکھا اور اپنے طویل ادبی سفر میں چالیس سے زائد کہانیاں، تیرہ ناول وناولٹ لکھے ہیں۔ پیتل کا گھنٹہ، مالکن، ٹھاکر دوارہ، رضو باجی، اُن کے معروف افسانے، شب گزیدہ، مجو بھیا، بادل، صلاح الدین ایوبی، داراشکوہ، غالب اور خالد بن ولید مشہور ناول ہیں۔

قاضی صاحب کی شخصیت کا واضح پہلو، بیباکی، زندہ دلی، استقلال اور جرأت ہے۔ اُن کے مزاج میں غیرت اور خودداری کا رنگ بہت گہرا تھا۔ موصوف کے تخلیقی کرداروں میں جتنا کروفر اور گھن گرج ہے، نجی زندگی میں اُتنی ہی نرمی اور نزاکت تھی، جس کی درجنوں مثالیں زبان خاص وعام میں نشان زد ہیں۔

ان گنت صدمات سے دوچار ہونے والے اس فکشن نگار کی اپنی داستان، قربانیوں، آزمائشوں اور سخت امتحانوں کی دل آویز اور

بصیرت افروز تاریخ ہے۔ شاید اِس وجہ سے بھی کہ تاریخ قاضی صاحب کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ انھوں نے تقسیم ہند سے پہلے کے اودھی معاشرے سے خاص مواد حاصل کیا۔ یہ وہ معاشرہ ہے جس میں نوآبادیاتی نظام دم توڑتا اور زمین دارانہ ماحول سسکتا ہوا نظر آتا ہے اور پھر اِس کینوس کو وسیع کرتے ہوئے اُسے تبدیل ہوتی ہوئی عالمی تاریخ سے منسلک کر دیا ہے جس میں طبقاتی اور تہذیبی شعور کے ساتھ ساتھ، مطالعے ومشاہدے کی وسعت کے ذریعے، تاریخی ناولوں میں تابنا کی پیدا ہوگئی ہے۔ ماضی کی تہذیب اور اُس کی نیرنگیوں کی مختلف جہتوں کو قاضی صاحب نے نہایت فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ خصوصاً میدانِ جنگ کی بساط بچھانے میں جس حکمت عملی یا جن نفسیاتی حربوں کا فریقین سہارا لیتے ہیں، اُس کو منظّم طریقے سے پیش کرنے میں اُنھیں مہارت حاصل تھی اور اِس معاملہ میں اُن کا خطیبانہ اُسلوب بے حد معاون ہوتا ہے۔ دراصل انھوں نے روایتی تخلیقی اظہار سے شعوری طور پر انحراف کرتے ہوئے اپنی تحریر کو زندگی اور حرارت پہنچانے والا اسلوب عطا کیا ہے جو قاری کو متاثر ہی نہیں، مرعوب بھی کرتا ہے۔ یہ بات قاضی صاحب کے شاگردوں تک محدود نہیں بلکہ ہر مداح پر عیاں ہے کہ وہ جب فن پاروں میں اپنی انانیت کی انتہائی بلندی پر پہنچتے ہیں، تو قاری دیر تک اُن کی خود اعتمادی اور بلند حوصلگی کے سحر میں گرفتار رہتا ہے۔ اُن کی اِس ہُنر مندی، خوش بیانی اور گل افشانیِ گفتار سے کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے مگر چھا جانے اور گھر کر لینے والے مخصوص اسٹائل کا اعتراف ضرور کرنا ہوگا۔ اردو دُنیا میں اُن کے منفرد اسلوبِ بیان نے ایک نئے ادبی مزاج کی تشکیل کی ہے جسے برقرار رکھنا ہم سب کے لیے لازم ہے۔ خصوصاً تاریخ، تہذیب اور ثقافت سے محبت کرنے والوں پر یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اردو، ہندی حلقے کی آبرو، گنگا جمنی تہذیب کے امین، بے باک مبصر، انفرادی طرزِ فکر کے ادیب اور مشفق استاد کو اپنی تحریروں اور حافظوں میں محفوظ و مامون کریں۔ بلاشبہ اُن کے بچھڑنے کا یہ سانحہ محض فکشن کے لیے ہی نہیں، اردو ادب کے لیے بھی ایک عظیم سانحہ ہے۔

◆◆◆

مثنوی چراغِ دیر (مع پانچ اردو تراجم)

غالبؔ کی مثنوی ''چراغِ دیر'' مع پانچ اردو تراجم، اردو اکادمی، دہلی کی تازہ ترین کتاب ہے جسے ممتاز محقق، ناقد و شاعر اور دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر صادق نے مرتب کی ہے۔ آپ نے تلاش و تحقیق کے بعد اردو کے پانچ اہم ادیبوں کے ترجموں کو حاصل کیا ان میں ظ۔ انصاری، اختر حسن، علی سردار جعفری، حنیف نقوی اور کالیداس گپتا رضا کے تراجم ہیں۔ اختر اسن اور حنیف نقوی نے منظوم ترجمہ کیا ہے جب کہ بقیہ تین تراجم منثور ہیں۔ ''مثنوی چراغِ دیر'' مرزا اسداللہ خاں غالب کی فارسی شاعری کا ایسا شاہکار نمونہ ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ مرزا غالب نے یہ مثنوی سفر کلکتہ کے دوران بنارس میں قیام کے دوران لکھی تھی۔ پروفیسر صادق نے اس کام کو ایسے سلیقے سے انجام دیا ہے کہ اس مثنوی کی اہمیت دوبالا ہوگئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب ریسرچ اسکالرز کی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگی۔

مرتب: پروفیسر صادق

صفحات: ۱۰۸، قیمت: ۴۵ روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی